



# بارِ شناسائی

مفتی منیب الرحمن

ناروے اور یورپ کے سفر پر روانگی کے وقت لاہور ایئر پورٹ کے لاؤنج میں ہمارے رفیق سفر مولانا طاہر عزیز باروی نے پاکستان کے سابق سفیر جناب کرامت اللہ غوری کی کتاب ”بارِ شناسائی“ ہاتھ میں تھادی۔ دورانِ پرواز اُسے پڑھنا شروع کیا اور ختم کر کے دم لیا۔ یہ دراصل ہمارے مختلف حکمرانوں کے بارے میں اُن کے مشاہدات و تاثرات ہیں، جو انہوں نے بلا کم و کاست رقم کر دیے ہیں۔ اس کتاب کا نام مصنف نے ”ہوئے جو خاک بسر“ سوچا تھا، لیکن اپنے دوست جناب رسول احمد کلیمی کے مشورے سے ”بارِ شناسائی“ رکھا۔ جناب آغا شورش کاشیری شخصیتوں کے قلمی خاکے لکھتے وقت یہ عنوان باندھتے تھے: ”آنکھیں میری باقی اُن کا“۔ ایک اور صاحبِ قلم ”دید شنید“ کا عنوان اختیار کرتے۔ حفیظ جانندہری نے کہا تھا:

آنے لگا ہے اپنی حقیقت سے ڈر مجھے      کیوں دیکھتے ہیں غور سے، اہل نظر مجھے  
”اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی“      پھر یہ نہیں، تو کھاگئی کس کی نظر مجھے

سو جناب کرامت اللہ غوری ”اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی“ نام بھی رکھ سکتے تھے۔ مصنف نے اس کتاب میں چھ سابق حکمرانوں اور تین علمی و ادبی شخصیات کے خاکے مرتب کیے ہیں۔ مصنف چونکہ اہل زبان ہیں، اس لیے قاری کو اس کتاب میں اردو زبان کی لطافت اور چاشنی ضرور ملے گی، جو آج کل نایاب نہیں تو کم یا ب ضرور ہے۔ جناب عمران خان کو انہوں نے ایک مقبول عام کرکٹر اور شوکت خانم ہاسپٹل کا بانی ہونے کی وجہ سے قومی ہیرو کے طور پر لیا ہے۔ اب خدا معلوم! سیاست دان عمران خان کے بارے میں اُن کا زاویہ نظر کیا ہوگا، اس کے لیے ہمیں اُن کی اگلی کتاب کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسی طرح انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں لکھا: ”بہر اِجس کی ہم نے قدر نہ کی“۔ جناب کرامت اللہ غوری کی خدمت میں عرض ہے کہ پاکستان کے دینی حلقوں کو قادیانی ہونے کی حیثیت سے اُن کے عقائد سے اختلاف ہے اور یہ مسئلہ دستور پاکستان کی دوسری ترمیم میں متفقہ طور پر طے ہو چکا ہے۔ ایک نوبل انعام یافتہ عالمی سائنسدان کی حیثیت سے اُن کے مقام سے کسی کو اختلاف نہیں، ہم دیگر غیر مسلم سائنسدانوں کی سائنسی ایجادات پر بھی اُن کی تحسین کرتے ہیں اور انسانیت اُن ایجادات سے مستفید ہو رہی ہے۔ البتہ اُن کی سائنسی قابلیت سے فائدہ اٹھانا ہماری حکومت، یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تحقیقی اداروں کا کام تھا، اس کے لیے مذہبی حلقوں کو دوش دینا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں نے جناب حکیم محمد سعید کو ایک غیر متنازع قومی شخصیت کے طور پر لیا ہے، یہ درست ہے۔ مصنف نے بجا طور پر لکھا: ”وضع داری اور جامہ زہبی حکیم سعید پر ختم تھی“۔ غوری صاحب جناب حکیم محمد سعید کا دردِ دل بیان کرتے ہیں:

”حکیم صاحب کا یہ گلمہ، جو وہ مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے، غلط نہیں تھا کہ ہماری نئی نسل کے خود ساختہ رہنماؤں اور نیتاؤں نے



نوجوانوں کے ہاتھ سے قلم چھین کر کلاشکوف تھما دی ہے اور اب سینہ قرطاس پر علم کے موتی بکھرنے کے بجائے دھرتی کے سینے پر آئے دن لہو کی تحریریں لکھی جا رہی ہیں۔ انہی ناپاس اور بد بخت ہاتھوں نے حکیم سعید کے نجیب خون کو بھی پاکستان کی مٹی کی خوراک بنا دیا۔ مصنف نے حکیم محمد سعید مرحوم کو ایک شعر کی صورت میں غیر معمولی خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے، اگر یہ کتاب اُن کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ یقیناً قلبی اطمینان محسوس کرتے اور مصنف کی قدر و منزلت اُن کے دل میں اور بڑھ جاتی:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے، وہ لوگ آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی ہیں!

جنرل محمد ضیاء الحق کے اخلاقی شعار کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد اس بیان سے ضیاء الحق کی وفات کے دن بھی متفق نہیں تھی، نہ آج ہے اور نہ کل ہوگی۔ وہ بلاشبہ ایک انتہائی متنازع شخصیت تھے اور رہیں گے۔ لیکن ایک حقیقت، جس کا میں آج بھی بلا خوف تردید اعادہ اور تواتر کر سکتا ہوں، یہ ہے کہ میں نے ۳۵ برس کی سفارتی اور سرکاری ملازمت کی تمام مدت میں ضیاء الحق سے زیادہ نرم خور اور حلیم انسان نہیں دیکھا۔ تاریخ ضیاء الحق کی ذات کے متعلق جو بھی فیصلہ کرے، اس سے مجھے سروکار نہیں ہے، لیکن کوئی بھی دیانت دار مؤرخ ان کے خلق اور اخلاق کے ضمن میں میرے بیان کی تردید نہیں کر سکے گا۔“ وہ اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں: ”میں نے تو اس سے پہلے اپنے سے بڑے منصب والے سرکاری افسر کو بھی اس درجہ شفیق نہیں پایا، چہ جائیکہ صدر مملکت ایک انیس گریڈ کے افسر کو اس درجہ عزت سے نواز رہے تھے، لیکن اُن کی یہ وضع داری بوجہ وقتی یا ایک مرتبہ کی کیفیت نہیں تھی۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ”جتنی مرتبہ میں اُن کے دفتر یا رہائش گاہ پر گیا، کبھی یہ نہیں ہوا کہ وہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے نہ آئے ہوں، اُن کی یہ وضع داری اور شرافت طبع پاکستانی زعماء، قائدین اور سیاستدانوں کے دُمرے میں بلاشبہ اپنی مثال آپ تھی۔۔۔۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ”اُن کے معترضین یہ کہا کرتے تھے کہ ضیاء الحق جو اس قدر رُخبر اور انکسار کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو اصل میں یہ سب ڈراما ہے، سب بہروپ ہے، اُن کے اندر جو میل ہے، پاکستان پر روز بروز دہشتی سے قبضہ کرنے اور دھونس ڈالنے سے حکومت کرنے کا احساسِ جرم انہیں اندر ہی اندر کدیر تارہتا ہے، اُسے چھپانے اور اس پر غاڑہ ملنے کے لیے وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں تاکہ لوگ اصل ضیاء الحق کو نہ دیکھ سکیں۔ معترضین کی بات میں اور اُن کے دلائل میں وزن ہو سکتا ہے، لیکن جو بے ساختگی ضیاء الحق کے ہاں میل جول کے حوالے سے میں نے دیکھی اور محسوس کی، اُس میں کہیں بھی مجھے اداکاری یا ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سربراہانِ مملکت، وزیروں اور سفیروں سے جس تپاک سے ملتے تھے، اُس تپاک سے میں نے انہیں فرش پر جھاڑو لگانے والے خاکروب اور اُن کی گاڑی کا دروازہ کھولنے والے دربان سے بھی جھک کر ملتے اور گرجوئی کے ساتھ مصافحہ کرتے دیکھا۔ اگر وہ واقعی اداکاری تھی، تو کمال کی تھی۔“

مصنف نظریاتی اعتبار سے لبرل آدمی ہیں، مذہبی ذہن کے نہیں ہیں، لیکن خود اُن کا کہنا ہے کہ میں نے حقائق کسی کتر بیونت کے بغیر بیان کیے ہیں، چنانچہ انہوں نے دیانت داری سے جنرل محمد ضیاء الحق کے سیاسی کردار سے قطع نظر اُن کی اخلاقی خوبی کو بیان کیا ہے۔ اس میں ہمارے ہر عہد کے حکمرانوں کے لیے سبق ہے کہ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اُس کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے، کیونکہ: ”عطر آنت کہ خود بوی نہ کہ عطر بگوید۔“ آج کل ہماری سیاست کا شعار مخالفین کو گالی گلوچ اور شخصی توہین و تذلیل بن گیا ہے۔ مصنف جناب ذوالفقار علی بھٹو کی متضاد شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:



”میں نے اپنی زندگی میں ذوالفقار علی بھٹو جیسا ذہین انسان نہیں دیکھا اور میں نے اپنی زندگی میں بھٹو جیسا مغرور اور متکبر انسان بھی نہیں دیکھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ Lateral Entry کے ذریعے جناب بھٹو نے بیوروکریسی کا معیار گرا دیا۔“ وہ لکھتے ہیں: ”لیکن یہ سب کچھ یوں ممکن نہیں ہوا کہ بھٹو کی بے نظیر ذہانت اور تخلیقی صلاحیت پروڈیرہ شاہی اور جاگیر داری کی جو قلعی چڑھی ہوئی تھی، اس نے اصل بھٹو کو کبھی آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس آسب نے جو پیدائش سے ان کو گھیرے رہا تھا، آخر کار انہیں قبل از وقت قبر پہونچا دیا۔“ وہ لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھٹو جیسے زیرک اور سفاکی کی حد تک چالاک سیاست دان نے، جس کی گھٹی میں وڈیرہ شاہی پڑی تھی، پاکستان کے کم تعلیم یافتہ اور سادہ لوح عوام کی کم علمی اور بھولپن سے بے انتہا ناجائز فائدہ اٹھایا۔“ وہ مزید لکھتے ہیں:

”بھٹو نے پاکستانی عوام کی اکثریت کو دن میں خواب دکھایا تھا اور یہ ان کی سحر بیانی کی تاثیر یا اعجاز تھا کہ عوام نے اس کو سچ جان لیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اب پاکستان پر وہی راج کریں گے، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ پینلز پارٹی نہ عوام کی تھی، نہ عوام کے لیے تھی۔ بھٹو نے عوامی ہونے کا نعرہ ضرور لگایا تھا، لیکن یہ محض ایک نعرہ تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل میں عوامی چولے نے پاکستان کے وڈیروں، چودھریوں اور جاگیر داروں کو ایک ایسی ردافراہم کر دی تھی، جس میں لپٹ کر وہ اپنے اصل چہرے چھپا سکتے تھے اور انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کا ثبوت اس حقیقت سے مل گیا کہ اقتدار میں آنے کے چند ہفتوں کے اندر اندر پارٹی کے سوشلسٹ لیڈر ایک ایک کر کے مظہر عام سے غائب ہو گئے، بلکہ جبراً معدوم کر دیئے گئے۔ معراج محمد خاں، ڈاکٹر مبشر حسن اور جے اے رحیم تینوں ہی پینلز پارٹی کے اُن عناصر اُرجہ میں شمار کیے جاتے تھے، جن میں چوتھا ستون خود بھٹو صاحب تھے۔ جے اے رحیم کا تعلق ہماری فارن سروس سے تھا اور وہ سروس کے بزرگ ترین افسروں میں سے تھے۔ ان کی لیاقت اور صلاحیت ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی اور پارٹی کے ان رازوں میں جو عام تھے، یہ راز سب سے زیادہ زبان زد عام تھا کہ پارٹی کا منشور رحیم صاحب نے تحریر کیا تھا، جس کے لیے نظریاتی مواد معراج محمد خاں اور ڈاکٹر مبشر حسن کے اذہان رسا نے فراہم کیا تھا اور اس تئیلیٹی جو ہر سے پارٹی کی فکری آبیاری کی گئی تھی۔“ مصنف جنرل پرویز مشرف کے بارے میں لکھتے ہیں:

”پاکستان کے کسی آمر اور طالع آزمائے ملک و قوم کی ذلت اور رسوائی کا ایسا سامان نہیں کیا، جیسا مشرف نے کیا۔ اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کے لیے انہوں نے پورے ملک کو سامراج کے ہاتھوں گروی رکھ دیا اور ملک کی غلامی کا وہ بدترین دور آج تک جاری ہے اور نہ جانے ابھی کتنے برس اور جاری رہے گا۔ مجھے حیرت تو ان لوگوں پر ہوتی ہے جو آج بھی ریاست کے ستونوں کو کمزور کرنے والے اس بدست آمر کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ قدیم یونانیوں کے ہاں ایک محاورہ زبان زد عام تھا کہ: ”دیوتا جس قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں، اس کے لوگوں کو پہلے پاگل بنادیتے ہیں۔“ مشرف کے حاشیہ بردار اور کھاتے دار بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔“ انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے اقتدار کی راہ ہموار کرنے والے جنرل عزیز کو منافق اعظم بھی قرار دیا ہے۔

اس کتاب پر جناب رضا علی عابدی اور جناب عبدالرؤف کلاسرا کی طرف سے تبصرے قومی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ پبلشر کی معذرت کے سبب اس کتاب کی پہلی اشاعت پاکستان سے نہ ہو سکی، سو پہلا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا۔ ہمارا میڈیا روزانہ مسند نشین حکمرانوں کا جو حشر کرتا ہے، یہ کتاب تو اُس کا عشرِ عشر بھی نہیں ہے، پبلشر کی معذرت حیرت کا باعث ہے۔